محمد مظہر الدین صدیقی

اسلامی تحریک اور اس کا پیدا کردہ ذہن

اسلامی فکر فلاطونی فلسفہ اور نو فلاطونیت کی کامل تردید تھی۔ سب سے پہلے اسلام نے یونانی ثنویت کا ابطال کر کے زندگی، عمل اور فکر کی وحدت کا اثبات کیا۔ اس نے علم ظاہر اور علم باطن میں کوئی تفریق نہیں کی۔ اور نہ کسی فوق الحس عالم کا تخیل پیش کیا۔ وہ احساسات و مدرکات کو عقل کے منافی نہیں قرار دیتا اور نہ عقل کو وجدان کی ضد ٹھہراتا ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ کشف والہام کے ذریعہ حقائق اشیاء کی جستجو کرو۔ البتہ تفکر اور تدبر کی بار بار ہدایت کی گئی جس سے معلوم ہوا، کہ کشفی اور الہامی علم لازماً معتبر نہیں ہوتا۔ دراصل جس چیز کو وجدان اور الہام وغیرہ کہا جاتا ہے، وہ انسانی عقل کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس لئے جس طرح عقل بغیر دلائل و براہین کے محض دعووں پر اکتفا نہیں کر سکتی، اسی طرح الہامی اور وجدانی انکشافات بھی دلیل اور منطق سے مستغنی نہیں ہو سکتے جس عالم کو فوق الحس کہا جاتا ہے، وہ لطیف تر احساسات و تجربات کا عالم ہے اور یہ بھی فردِ واحد سے متعلق نہیں، بلکہ عقول لطیفہ کا ایک مشترک عالم ہے۔ پھر یونانی ثنویت کے مزید ابطال میں اسلام نے روح اور مادہ کے تضاد کا بھی انکار کیا۔ اس کے نزدیک روحانی زندگی مادی زندگی کی ایک بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے۔ جس معاشرہ میں انسانی تعلقات زیادہ ہم آہنگ ہوں، سیاسی معاشی اور مذہبی طبقاتیت کی شدت نہ ہو اور احترام انسانی کا جذبہ لوگوں میں عملاً کارفرما ہو، وہی معاشرہ روحانی حیثیت سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔

اسلام نے زندگی کو لعنت نہیں ایک خیر عظیم قرار دیا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ مِنَ الطَّيِّبٰتِ۔ (اعراف ۳۲)	کہدو کہ کس نے اللہ کی پیدا کی ہوئی زینتوں کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے عمدہ چیزوں میں سے نکالی ہیں۔

اس طرح اس نے نو افلاطونی فنا فی اللّٰہیت کا سارا فلسفہ مسترد کر دیا۔ کیونکہ اس نظریہ کی رُو سے سعادت انسانی کا دارومدار اس پر ہے کہ آدمی دُنیا ترک کر دے، علائق سے گریز کرے اور زندگی کی نعمتوں سے کنارہ کش رہے۔ یہ اصل میں بدھ مت کے عقیدۂ نروان کی ایک صوفیانہ شکل تھی، جس کو نو افلاطونیت نے پیش کیا تھا۔ بدھ مت کے نزدیک چونکہ زندگی ایک لعنت تھی، اس لئے اس سے بچنے اور حقیقت سے ہمکنار ہونے کا ذریعہ اس کے نزدیک صرف یہ تھا کہ انسان ریاضات و مجاہدات کے ذریعہ نفس کشی کرے اور عمل زندگی میں حصہ لینے یا دُنیا میں شرکت کرنے کے بجائے فکر و مراقبہ اور کشف باطنی کی کوششوں میں اُلجھا رہے۔ اس نظریہ کو نو افلاطونیت نے فنا فی اللّٰہیت کا رنگ دے کر انسان کو عقل و فکر اور تجربی ذہنیت سے ہٹا کر وجدان اور کشف کی طرف متوجہ کر دیا

جس کا مقصد یہ تھا کہ آدمی ذاتی طور پر روحانی سکون حاصل کرتا رہے، خواہ گرد و پیش کی دنیا میں انسانیت پامال ہو رہی ہو، روحانی اقدار کو کچلا جا رہا ہو اور مساواتِ انسانی کی علانیۃ تکذیب کی جا رہی ہو۔ بعد میں یہی فلسفہ اسلامی لباس پہن کر تصوف کی شکل میں نمودار ہوا۔ لیکن اسلام نے ان تمام صوفیانہ اور راہبانہ میلانات کی سختی سے مذمت کی۔ اس نے زندگی، ولولہ حیات اور جہد للقوۃ کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ انسانی سعادت کا راز یہ نہیں، کہ آدمی ظاہر سے منہ موڑ لے اور باطن میں ڈوب جائے۔ بلکہ اس کو باطن میں غوطہ لگا کر ظاہر کی اصلاح پر متوجہ ہونا چاہئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری جوانی عبادات میں گذار کر آخری عمر میں معاشرہ اور قوم کی اصلاح کی۔ یہ ہندو مت کے فلسفہ حیات سے کتنا مختلف طرزِ عمل تھا جس کی تعلیم یہ ہے کہ آخری عمر میں انسان کو دنیا چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں ریاضات و مجاہدات کرنے چاہئیں۔ بہاتما بدھ گیا میں ایک درخت کے نیچے پلتھی مار کر بیٹھ گئے، کہ میں اس وقت تک جنبش نہیں کروں گا جب تک نورِ حقیقت مجھ پر منکشف نہ ہو جائے۔ لیکن حضور سرورِ دو عالم نے ایک جگہ جمے رہنے کے بجائے ہجرت کا راستہ اختیار کیا۔ اور باطل کے خلاف صف آرا ہو کر حقائق کی دنیا بدل دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام سکون پر حرکت اور تغیر کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی نظر میں کوئی حقیقت بنی بنائی موجود نہیں، جس سے انسان ہمکنار ہونے کی کوشش کرے۔ یا جس کی تجلیات کے مشاہدہ کے لئے وہ مراقبہ اور مجاہدہ میں مگن رہے۔ بلکہ انسان اپنے عمل اور جدوجہد سے خود ہی حقیقت کی تعمیر و تشکیل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ نگاہِ بصیرت سے گرد و پیش کی دنیا اور اپنے ماحول کا تجزیہ کرے اور تجربات تاریخ کی طرف سے اندھا بہرا نہ ہو۔ بلکہ جزئیات سے کلیات کی طرف بڑھ کر معاشرہ کی ترقی اور زوال کے عمومی قوانین تک پہنچ سکے۔

دوسرے الفاظ میں اسلام سکونِ روحانی کا مذہب نہیں، بلکہ حرکتِ جاودانی اور عملِ پیہم کا پیغام ہے۔ ہجرت اور جہاد اسلام کے دونوں اصل الاصول معرفت الٰہی کے صوفیانہ نظریہ سے ٹکراتے ہیں۔ کیونکہ معرفت پرستش، عبادت، مراقبہ اور ذکر و فکر سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ انسانوں کی خدمت سے، ملک و قوم کی اصلاح سے اور انسانیت کو بلند تر اور ارفع سطح پر لے جانے کی کوشش سے۔ اسلام کے نزدیک اصل نیکی خدمتِ خلق ہے۔ اور اس کی اعلیٰ ترین شکل یہ ہے کہ آدمی اپنے معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کرے۔ اسے اقدارِ سیئہ کے بھنور سے نکال کر اقدارِ عالیہ کی طرف لائے۔ محروم الحقوق طبقات کو ان کے جائز حقوق دلوائے۔ مذہبی پیشوائیت، معاشی اجارہ داری اور سیاسی استبداد کو مٹا کر انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معاشرہ میں طبقاتی امتیازات اور معاشی اونچ نیچ باقی ہو۔ یا سیاسی اور مذہبی قوت ایک محدود طبقہ کے ہاتھوں میں مرکوز ہو۔ اسی لئے اسلام نے جہاد کو افضل العبادات قرار دیا ہے:۔

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ۔ (حج ۷۸) اللہ کے راستہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔

لیکن یہ جہاد اس کا نام نہیں کہ ہم تلوار لے کر غیر مسلموں پر چڑھ دوڑیں، خواہ غیر مسلم اقوام اخلاق اور انصاف میں ہم سے آگے ہوں اور خود اپنی اور اپنے گھر کی خرابیوں کو نظر انداز کر دیں۔ جہاد نفس انفرادی سے شروع ہوتا ہے۔ پھر معاشرہ اور قومی اصلاح کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ جب تک ہمارا اپنا گھر پاک و صاف نہ ہو، جب تک ہمارے اپنے معاشرہ میں معاشی عدل، سیاسی مساوات اور مذہبی رواداری

کی کمی ہو، اس وقت ہمیں یہ حق کس طرح پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیروں کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھیں۔ آج مسلمانوں کو سب سے پہلے اپنے خلاف جہاد کرنا ہوگا قبل اس کے کہ وہ دوسروں کے خلاف جہاد کا تصور کریں۔

مختصر یہ کہ اسلام فکر اور ذکر کے بجائے عمل کا پیغام لایا، معرفت الٰہی کے صوفیانہ طریق کے بجائے . . . . اس نے مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی کی تلقین کی۔ اور وجدان والہام کی بے حقیقت کوششوں کی جگہ اس نے عقلی، حسّی اور تجربی طریق کا علم بلند کیا۔ وہ جزئیاتِ تجربہ یا احساسات کو باطل نہیں ٹھہراتا اور مادّی حسّی تجربات کو عقلی بصیرت کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

انّ السمع والبصر والفواد کلّ اولئك عنه کان مسئولا۔ (بنی اسرائیل)
یعنی تمہاری آنکھ، کان اور دل سب کے بارے میں تم سے پُرسش کی جائے گی۔

اسی طرح اس نے یہ بھی بتا دیا کہ ہر چیز کو یہاں تک کہ خدا کے کلام کو بھی عقل کے میزان میں تولا جا سکتا ہے اور انسان کسی چیز پر بے سمجھے بوجھے ایمان لانے پر مجبور نہیں:

والذین اذا ذکّروا بآیاتِ ربّھم لم یخرّوا علیھا صمًّا وعمیانًا۔ (الفرقان ۶/۲)
یعنی مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے آیاتِ الٰہی پیش کی جائیں تو وہ اُن پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے۔

یہ ایک ایسی عقلی آزادی کا اعلان تھا جس سے دُنیا اب تک ناآشنا تھی۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ نوافلاطونی تصوّف کے تحت انسان کے مہمل سے مہمل وجدانات اور بے اصل مکاشفات کو عقل و دانائی قرار دیا گیا تھا۔ اسلام نے فکر و تدبّر اور دیانتدارانہ تنقید کو اپنے مذہبی اصولوں میں شامل کیا۔ اسلام حسّی اور تجربی طریق کا رکا اس لئے بھی حامی تھا کہ اس کے بغیر اخلاقی زندگی کی تکمیل ممکن نہیں۔ روحانیت اور اخلاق کا سارا مواد بالکل اسی طرح احساسات و تجربات کی زندگی پر مشتمل ہے جس طرح علم و عقل کا مواد۔ نوافلاطونی تصوّف کے مطابق روحانیت کا کمال یہ ہے کہ انسان احساسات و تجربات سے محرومی اختیار کر کے خالص فکری زندگی اور ریاضات و عبادات پر قناعت کرے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک اخلاق کی تکمیل بغیر اس کے ممکن نہیں کہ انسان معاشرت او تمدّن کے مشاغل میں پوری طرح شریک ہو کر جزئیات تجربہ سے مستفید ہو۔ پھر چونکہ معاشرہ کی زندگی افراد کے احساسات سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے حسّی زندگی اسلامی تصوّر روحانیت کا ایک جزو لازم ہے۔ اسلام راہب نہیں پیدا کرنا چاہتا جنہیں انسانوں کے احساسات و ضروریات کا کوئی پاس و لحاظ نہ ہو۔ وہ ایسے باعمل افراد پیدا کرنا چاہتا ہے جو معاشرہ میں رہ کر اس کی خرابیوں اور اچھائیوں کا تجربہ کریں، اور پھر اپنے دست و بازو کی قوت اور اعلیٰ تنظیمی اور اجتماعی قابلیت سے تمدّن کو بُرائیوں سے پاک کریں اور اسے اقدارِ عالیہ سے روشناس کریں۔ اس طرح اسلامی تحریک افلاطونی فکر اور عیسائی تصوّف کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل تھی۔

اس کا ایک اور ثبوت ہمیں اسلام کی اجتماعیت میں بھی ملتا ہے۔ اسلام سے پہلے فلاطونی فکر، نو فلاطونی فلسفہ اور عیسائی تصوّف نے مل کر انسان پر مذہب، روحانیت اور اخلاق کا انفرادی تصوّر مسلط کر دیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہر انسان اپنی نجات و سعادت خود غرضانہ طور پر

اور دوسرے انسانوں کی فلاح وصلاح سے بے تعلق ہوکر محض رسمی اور ظاہری عبادات، راہبانہ ترکِ زندگی اور صوفیانہ خانقاہیت کے طریقہ سے حاصل کرسکتا ہے۔ اسلام نے بتایا کہ انسانی فلاح وسعادت معاشرہ اور اجتماع کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اگر معاشرہ بحیثیت مجموعی اور جماعت من حیث الکل غلط اصولوں اور غیر منصفانہ بنیادوں پر قائم ہو تو کوئی فرد محض اپنی ذاتی کوشش سے فلاح یافتہ نہیں بن سکتا۔ ایک فرد کی فلاح تمام افراد انسانی کی فلاح کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اشخاص کی سعادت کا دارومدار معاشرہ کی خوبی تنظیم پر ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری ذاتی نجات کا انحصار اس پر ہے کہ تمام افراد معاشرہ کو نجات وسعادت کے وسائل حاصل ہوں۔ خود غرضانہ طور پر تنِ تنہا اور دوسروں کی روحانی سعادت اور مادّی فلاح کا خیال کئے بغیر کوئی فرد نہ نجات حاصل کرسکتا ہے اور نہ سعادت روحانی یا فلاح انسانی۔ اسلام نجات کو ایک منفی تصور قرار دیتا ہے۔ محض بُرائی سے بچنا کوئی بلند نصب العین نہیں۔ انسان کو ایجاباً حصول خیر کی کوشش کرنی چاہئے۔ اسلام فلاح کا مذہب ہے نجات کا نہیں۔ وہ زندگی کے بارے میں ایک ایجابی نقطہ نظر اختیار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کا مطمح نظر فلاح انسانی ہونی چاہئے۔ نہ کہ محض بچاؤ اور خود کی روحانی حفاظت۔ وہ روحانی تحفّظ کو بزدلی کی علامت قرار دیتا ہے۔ کیونکہ محض تحفّظ یا بچاؤ خواہ روحانی ہو یا مادّی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس سے بلند تر نصب العین توسیع ذات اور تکمیل صفات ہے۔ جو صرف مجاہدانہ ذہنیت اور توسیعی قابلیت سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پھر یہ نصب العین انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ فرد تنہا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کی ساری اہمیّت اور معنویت کا سرچشمہ ملّت ہے۔ ملّت ہی کی استواری مضبوطی تعمیر وتزئین اور اصلاح ودرستگی کے ساتھ اس کی ذاتی ترقی وابستہ ہے خواہ یہ ترقی مادّی ہو یا روحانی۔ اسلام نے

تخلّقوا باخلاق اللہ — اللہ کے صفات میں رنگ جاؤ

کی جو تعلیم دی ہے اس کا تعلق فرد سے نہیں جماعت سے ہے۔ وہ صرف اچھے پاکباز افراد پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ ایک ستھرا اور پاکیزہ معاشرہ بھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اچھے افراد صرف اچھے معاشرے میں پیدا ہوسکتے ہیں۔ خدا کی رحمانیت اس کی ربوبیّت اس کی رزّاقی اور اس کی ہدایت ورہنمائی غرضیکہ تمام اسمائے حسنہ معاشرہ کی بناوٹ اور تمدن کی ہیئت ترکیبی میں منعکس ہونے چاہئیں۔ تب ہی افراد بھی ان صفات کی جلوہ گاہ بن سکتے ہیں۔ اس خیال میں کوئی صداقت نہیں کہ افراد اچھے ہوجائیں تو معاشرہ خود بخود درست ہوجائیگا۔ بے شک اچھے افراد ہی اچھا معاشرہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی سیرت کے حُسن وجمال پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ پوری اجتماعی اور تمدنی زندگی کو اپنے نمونہ پر ڈھالنے کی کوشش کریں۔ ورنہ چند منتشر غیر منظّم افراد کی نیکیوں اور حُسنِ سیرت سے عام انسانوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوسکتی۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انفرادی تبلیغ پر قناعت فرماتے، ایک منظّم جماعت نہ پیدا کرتے، اور پھر یہ جماعت اپنی متحدہ قوت اور جدوجہد سے سوسائٹی کو منقلب نہ کردیتی تو اسلام بھی عیسائیت کی طرح ایک انفرادی عقیدہ اور ذاتی نجات کا تصور بن جاتا۔ اور وہ کوئی معاشرہ اور ملّت نہ پیدا کرتا۔ لیکن اسلام کوئی پرائیویٹ مذہب نہیں۔ وہ ایک اجتماعی دین ہے، ایک محسوس تہذیب ثقافت اور ایک مکمّل معاشرہ ہے۔ اگر یہ صوفیوں کے مذہب کی طرح ایک شخصی عقیدہ کا نام ہوتا یا محض تزکیہ نفس کی کوششوں سے عبارت ہوتا، تو قرآن میں نہ زکوٰۃ کے احکام پائے جاتے، نہ دولت کے خرچ اور تقسیم کے

بارے میں کوئی ہدایت ملتی، نہ ہی وارثوں، اقرباء اور پڑوسیوں کے حقوق کا کوئی ذکر ہوتا، نہ جہاد نفس، جہاد مال اور قتال فی سبیل اللہ کا اس میں کوئی حکم ہوتا نہ جنگ وصلح، دوستی، دشمنی اور بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں قرآن اپنے موقف کی وضاحت کرتا، کیونکہ ان سب امور کا تعلق ایک معاشرہ اور منظم جماعت سے ہے، جو تمدن کی گاڑی کو چلانا اور تہذیب کے اقدار کو بدلنا چاہتی ہو۔

پھر اسلام ہی وہ مذہب تھا جس نے سب سے پہلے یہ سائنٹیفک تصور پیش کیا کہ کائناتِ عالم چند مقررہ قوانین و ضوابط کے مطابق چل رہی ہے اور کسی بے اصول اور بے آئین ہستی کی تخلیق نہیں، جو بلا کسی منظم ارادہ، مقصد اور بغیر کسی باضابطہ مشیت کے اسے حرکت دے رہا ہو۔ دوسرے الفاظ میں جدید سائنسی اور علمی زاویہ نگاہ جس کی رُو سے حیات وکائنات کی تمام تبدیلیاں، تاریخ کے تمام انقلابات اور معاشرت وتمدن کے سارے متغیر مظاہر اسباب وعلل کے ایک سلسلہ کے تحت اور ایک خاص قانون اور ضابطہ کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں، اسلامی تعلیمات کی لازمی اور منطقی پیداوار ہے۔ اسلام سے پہلے خدا کا تصور تو موجود تھا مگر خدا کے قوانین کا تصور ناپید تھا۔ چنانچہ پہلے تو قرآن نے خدا اور اس کی کائنات کے بامقصد ہونے کا اعلان کیا:

وما خلقنا السمآء والارض وما بینھما لاعبین لو اردنا ان نتخذ لھوًا لاتخذناہ من لدنّا ان کنا فاعلین ۔ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق۔ (انبیاء ۲/۸)

اور ہم نے آسمان وزمین اور اس کے درمیان جو کچھ ہے اس کو ہنسی مذاق میں نہیں پیدا کیا، اگر ہم محض لہو ولعب کے لئے اس کو بناتے تو ہمارے پاس اس کے اور طریقے بھی تھے، اصل بات یہ ہے کہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں، اور باطل اسی دم ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں یہ صاف بتا دیا گیا ہے کہ واقعات کائنات یونہی بے مقصد اور بے ربط نہیں بلکہ ان کے اندر ایک خاص قانون کے مطابق حق کی فتح اور باطل کی شکست کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر اس آیت پر گہری نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خداوند تعالےٰ کائناتِ عالم کے حالات وواقعات کی ایک توجیہ بتا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان واقعات وتغیرات میں حق کا مسلسل ظہور ہوتا رہتا ہے یعنی جب پرانی سچائیاں مسخ ہو جاتی ہیں اور اُن میں باطل کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ تو خداوند تعالیٰ نئی سچائیوں کو سامنے لاتا ہے جن کے مقابلہ میں باطل دب جاتا ہے۔ اس طرح واقعاتِ عالم ایک خاص قانون کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت سے پہلے کی آیات میں اُن تاریخی حوادث کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ظالم اور بدکار قوموں کی ہلاکت عمل میں آئی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وکم قصمنا من قریۃٍ کانت ظالمۃً وانشأنا من بعدھا قومًا آخرین فلمّا احسّوا بأسنا اذا ھم منھا یرکضون لا ترکضوا وارجعوا الی ما اترفتم فیہ ومساکنکم لعلکم تسئلون، قالوا یٰویلنا انا کنا ظالمین۔ فما زالت تلک دعوٰھم حتّٰی جعلناھم حصیدًا خامدین۔ وما خلقنا السمآء

یعنی ہم نے بہت سی بستیوں کو جہاں کے لوگ بڑے ظالم تھے توڑ پھوڑ کر برباد کر دیا اور اُن کے بعد دوسرے لوگ اُٹھا کھڑے کئے۔ تو جب اُن ہلاک ہونے والوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو اس بستی سے بھاگے۔ ہم نے کہا بھاگو مت بلکہ اسی سازوسامان دُنیا کی طرف لوٹ جاؤ، جس سے تم عیش وعشرت کے مزے لوٹتے تھے اور اپنے مکانوں کی طرف واپس جاؤ۔ انہوں نے کہا بے شک ہم خطاوار تھے

والارض وما بینھما لاعبین (انبیاء۔ رکوع ۲)

وہ لوگ برابر یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایسا برباد کر دیا جیسے کھیتے ہوئے کھیت، اور ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اسے ہنسی مذاق میں نہیں پیدا کیا۔

یہ کیا بات ہے کہ قرآن تاریخی انقلابات اور بدکردار قوموں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے دفعۃً مضمون کا رُخ اس طرف موڑ دیتا ہے کہ ہم نے کائنات کو ہنسی مذاق میں نہیں پیدا کیا، بلکہ یہ سارا نظام ایک مقصد اور قانون کے تحت چل رہا ہے۔ کیا اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ ہو سکتا ہے کہ دُنیا میں اعمالِ انسانی ایک سلسلہ اسباب و نتائج کے تحت رونما ہوتے ہیں اور زندگی کی تمام تبدیلیاں اور تغیرّات ایک اٹل قانون کے تابع ہیں۔ کسی اندھی بہری مشیّت کی تخلیق نہیں۔ اور نہ کسی ایسے خدا کی مرضی کا نتیجہ ہیں جو ایک مطلق العنان فرمانروا کی طرح کسی اصول و قانون اور آئین کا پابند نہ ہو۔ بلکہ من مانے طور پر جو چاہے کر گزرے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ایک دو جگہ نہیں بے شمار مواقع پر بیان کیا ہے۔ کہ اعمالِ انسانی کے اچھے اور بُرے نتائج ناگزیر ہیں۔ اور محض دعاؤں یا تمناؤں سے سلسلہ اسباب و علل کو نہیں بدلا جا سکتا۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

لیس بامانیکم ولا امانیّ اھل الکتاب من یعمل سوءً یجزبہ۔ (سورہ نسا ۱۸/۱۲۴)

نہ تمہاری آرزوؤں سے کچھ ہوتا ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں سے جو بُرا عمل کریگا وہ اس کا نتیجہ ضرور پائے گا۔

یہ آیت خدا کا کیا تصوّر پیش کرتی ہے، یہی کہ خدا کو کسی قوم، ملّت اور مذہب سے کوئی خاص نسبت و اُلفت نہیں۔ وہ نہ کسی قوم کو اس کے اعمالِ حسنہ کے صلہ سے محروم رکھتا ہے اور نہ کسی مذہب و ملّت کو بُرے اعمال کی پاداش سے بچاتا ہے۔ انسان جیسے اسباب جمع کریگا ویسے ہی نتائج سے دوچار ہوگا۔ کیا خدا کا یہ تصوّر ایک بے آئین فرمانروا کا تصوّر ہے کہ جو کسی قوم کو اس کی بُرائیوں کے باوجود محض اس لئے پاداشِ عمل سے محفوظ رکھے کہ وہ اس کی نام لیوا ہے۔ اور کسی قوم کو باوجود اعمالِ صالحہ کے مبتلائے مصیبت کر دے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ کسی خاص عقیدہ کی پابند نہیں۔ قرآن میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی جس سے ایک مطلق العنان خدا کا تصوّر پیدا ہو۔ درحقیقت قرآن اس جدید سائنسی نظریہ کی بہتمام و کمال حمایت کرتا ہے کہ مقررہ اسباب ہمیشہ مقررہ نتائج پیدا کرتے ہیں اور اگر ہم حیات و کائنات میں کوئی مفید مطلب تبدیلی پیدا کرنا چاہیں تو ہمیں اس کے لئے مطلوبہ اسباب پیدا اور فراہم کرنے ہوں گے۔ محض تمناؤں، دُعاؤں یا بُزرگوں کی کرامات سے واقعاتِ ہستی کا رُخ نہیں بدل سکتا۔

یہی طرزِ خیال اس دعویٰ میں بھی ملتا ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہ بدلے:

ان اللہ لا یغیّر ما بقوم حتیٰ یغیّروا ما بانفسھم۔ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔

یعنی تمام معاشرتی تبدیلیوں، سیاسی تغیرّات اور معاشی اصلاحات کی علّتِ فاعلہ خود انسان ہے۔ وہ جن اسباب کی تخلیق کریگا، جیسا معاشرہ قائم کریگا، جس قسم کا سیاسی نظام بنائے گا اور جس ہیئت معاشی کے تحت زندگی بسر کریگا اسی کے مطابق

اس کی قسمت تشکیل پائے گی۔ اگر اس کا سیاسی اور معاشی نظام عدل و انصاف اور اُخوت کے اُصولوں پر قائم نہ ہو۔ اگر اس کے معاشرہ میں حقوق یافتہ طبقات ساری دولت و ثروت پر قابض ہوں۔ اگر اس میں تعمیر و تخلیق اور خدمت کا جذبہ ناپید ہو تو ایسے معاشرہ میں برہمی انتشار اور بدنظمی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کا معاشی اور سیاسی نظام درست ہو۔ اگر اس میں مذہبی پیشوائی سیاسی اجارہ داری اور معاشی استحصال کے راستے مسدود ہوں تو یقیناً وہ معاشرہ مادّی فلاح اور روحانی ترقی سے ہمکنار ہوگا۔ قرآن میں جہاں کہیں انبیائے سابقین اور ان کے ہم عصر مذہبی پیشواؤں، سیاسی لیڈروں اور باثروت طبقوں کی باہمی آویزش کا حال بیان کیا گیا ہے اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر قرآن نے وضاحت سے کام نہیں لیا اور جدید اصطلاحات میں اپنے مفہوم کو نہیں بیان کیا۔ تو اس سے ہمارے اس نظریہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ قرآن کے مخاطب وہ لوگ تھے جو جدید اصطلاحات میں نہیں سوچتے تھے اور جن کی ذہنی اور علمی سطح ابھی تک بہت پست تھی۔ اس لئے قرآن نے طرز بیان اور اصطلاحات کے انتخاب میں ان کی رعایت کی لیکن اس کے بیانات کا منشا اور لبِّ لباب یہی ہے کہ انسان اپنی قسمت کی تشکیل پر قادر ہے اور اس کے مستقبل کا دار و مدار اس کی ہیئتِ اجتماعی اور معاشرہ کی ساخت پر ہے نہ کہ افراد کے ذاتی عقائد و اعمال یا لوگوں کے شخصی کردار اور رجحانات پر۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ ان کے اندر ایک ایسی جماعت ہمیشہ موجود رہنی چاہئے جو معاشرہ کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی عوامل پر کڑی نظر رکھے اور جہاں کہیں اس کو عدل و دیانت، حق و صداقت اور انصاف کے اصولوں سے ہٹتا ہوا پائے تو اُقوم کے ارباب بست و کشاد کو اس کی طرف توجہ دلائے:

ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (آل عمران ۱۱/۱۰۵)

تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو نیکیوں کی طرف بُلائے اور بُرائی سے بچنے کا حکم دے۔

ہمارے علماء اور صوفیائے دین کے انفرادی تصوّر کے تحت اس آیت کے معنے یہ لئے ہیں کہ اہلِ علم اور صلحاء کو روزہ نماز اور عبادات کی تاکید کرتے رہنا چاہئے اور لوگوں کو فواحش و کبائر سے روکنا چاہئے۔ لیکن یہ اس کا ایک نہایت تنگ اور محدود مفہوم ہے۔ ہمیں قرآن کے ایک عمومی حکم کی اس طرح تحدید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ملّت سیاسی انحطاط و انتشار میں مبتلا ہو، اس کا نظم معاشی ظلم و ستم کا آئینہ دار یا اس کی سیاست غلط روی پر مبنی ہو تو محض فواحش کو روکنے یا چند معروف نیکیوں اور عبادات کا حکم دیتے رہنے سے معاشرہ اور ہیئت سیاسی کو زوال سے نہیں بچایا جا سکتا۔ اسلام چونکہ ایک اجتماعی دین اور ایک مستقل معاشرہ ہے اس لئے وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس معاشرہ کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی ترکیب میں کیسا ہی بگاڑ پیدا ہو جائے، لیکن کوئی گروہ سامنے آکر اس کی ہیئت ترکیبی کو درست کرنے کی کوشش نہ کرے یا قوم کو اُن خطرات سے متنبہ نہ کرے جن سے وہ گزر رہی ہو۔ اس لئے قرآن کہتا ہے کہ سوسائٹی میں ایسے باشعور اور پاکباز انسانوں کا وجود ضروری ہے، جو اخلاقی جرأت سے کام لے کر وقت کے سیاسی اور معاشرتی خطرات سے قوم کو آگاہ کر دیں۔

مختصر یہ کہ اسلام ایک اجتماعی تحریک تھی۔ وجد و حال اور قیل و قال کا تصوّف نہ تھا۔ مگر یہ جاندار تحریک جس نے ایک منظم

معاشرہ کی بنیاد رکھی جس نے اپنے زمانہ کے نظامِ سیاسی اور معاشی اقتدار کو بدل دیا۔ جس نے انسان کو مجہولیت اور انفعال سے نکال کر ایک حقیقی قوتِ فاعلہ اور علّتِ مؤثرہ بنا دیا۔ جس نے نوفلاطونی اور عیسائی تصوّف کے اس خیال کی تردید کی کہ انسان ایک مجبورِ بے بس ہستی ہے جو زمانہ اور سوسائٹی کی سختیوں اور کلفتوں کو دور کرنے سے قاصر ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے سکونِ نفس اور اطمینانِ قلب کے لئے عالمِ خارجی سے مُنہ موڑ کر روحانی تجلّیات اور آسمانی مشاہدات میں منہمک ہو جائے۔ جس نے بتایا کہ انسان اپنی عقل و بصیرت، جدوجہد اور فعالیت سے حالاتِ وقت کو بدل سکتا ہے۔ زمانہ کے رُخ کو موڑ سکتا ہے اور اپنی تقدیر آپ بنا سکتا ہے، آج کیوں زوال و انحطاط میں مبتلا ہے اور کیوں اس کے پیروؤں میں اخلاق و دیانت سیاسی سمجھ بوجھ معاشی عدل و انصاف جرأتِ رائے، احتسابِ نفس کی صلاحیت اور اظہارِ حق کی قوت کا فقدان ہے جبکہ غیر مسلم قوموں میں یہی صفات آج سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کا جواب تین چار الفاظ میں مختصراً یہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک مطلق العنان بلکہ بے عنان خدا کا تصوّر، سیاسی زندگی میں ملوکیت اور اس کے پیدا کردہ غلامانہ میلانات مذہبی زندگی میں بدعت اور نوفلاطونی تصوّف کا داخلہ اور علمائے ظاہر کی بڑھتی ہوئی لفظ پرستی۔

افکارِ ابنِ خلدون

مصنفہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی

قیمت تین روپے

طب العرب

مترجمہ حکیم سیّد علی احمد صاحب نیّر واسطی

قیمت چھ روپے

اسلام اور مسئلہ زمین

مصنفہ پروفیسر محمود احمد

قیمت ۸ے

اسلام میں حیثیتِ نسواں

مصنفہ محمد مظہرالدین صاحب صدیقی

قیمت تین روپے

فقہ عمرؓ

مترجمہ مولوی ابویحییٰ امام خان صاحب

قیمت چار روپے

اسلام اور رواداری

مصنفہ رئیس احمد صاحب جعفری

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ۔ ۲ کلب روڈ ۔ لاہور